تعارفِ کتب

(عبد الحمید صدیقی)

تہذیبی بحران (THE CRISIS OF CIVILIZATION) ہمارے اس عہد میں تہذیب جدید کے جس قدر ناقدانہ جائزے لیے گئے ہیں اُن میں یہ جائزہ بڑا ہی صحیح اور بے لاگ ہے۔ اس کتاب کے مصنف الفرڈ کابن لندن یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ سے متعلق ہیں۔ انہوں نے تہذیب جدید کی ناکامیوں کو بیان کر دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ بڑی دیدہ وری سے اُن اسباب کا بھی کھوج لگانے کی کوشش کی ہے جنہوں نے اس تمدن کو اس نوبت تک پہنچایا ہے۔

انہوں نے سب سے پہلے جنگوں کی مختلف نوعیتوں پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ان کے بے شمار پہلو ہیں بعض جنگیں وہ ہیں جو محض اپنی برتری اور تفوق جتانے کے لیے لڑی جاتی ہیں۔ ان میں آدمی تو بلاشبہ کام آتے ہیں، مگر ان میں کوئی تہذیب، کوئی نظام حیات تباہ و برباد نہیں ہوتا لیکن جنگ کی ایک قسم وہ ہے جو نظریاتی تصادم کا مظہر ہوتی ہے اور جس کا مقصد ایک تہذیب و تمدن کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر اس کی جگہ ایک نیا نظامِ معاشرت تعمیر کرنا ہے۔ فاضل مصنف پھر اپنے عہد کی جنگوں کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ان کے محرکات نہایت گہرے ہیں اور ان کے تجزیے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا مقصد اس موجودہ نظام کو مٹا کر ایک نئے نظام کی تخلیق ہے۔

اسی ضمن میں انہوں نے ایک بات نہایت ہی پتے کی کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ موجودہ دور کا انسان پہلے انسانوں کے مقابلے میں زیادہ قسی القلب اور بے حس ہو گیا ہے اور اسی لیے وہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو کر بالکل وحشیوں کی طرح لڑ رہا ہے۔ آج بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہے، باپ بیٹے کے ساتھ برسرِ پیکار ہے۔ اس تصادم میں نہ کوئی اصول مدنظر ہے اور نہ کوئی اخلاقی قدر سامنے ہے محض وحشیانہ قوت انسان کی رہنما بن کر اسے ایک دوسرے سے لڑوا رہی ہے۔

پھر انہوں نے اس امر کی بھی وضاحت کی ہے کہ لڑنے جھگڑنے کا کام گو انسان پہلے بھی کرتا رہا ہے

لیکن اس نے آج سے پہلے کبھی مقصدِ حیات کی صورت اختیار نہ کر رکھی تھی۔ اخلاق کے بندھن ٹوٹنے اور انسانی قدروں کے پامال ہونے کے بعد اب جنگ و جدل حیاتِ انسانی کی غایتِ اولیٰ قرار پائی ہے۔ چنانچہ کتاب کے مصنف لکھتے ہیں:۔

"اخلاقی گرفت کے ہٹ جانے سے جنگ اپنی ذات میں ایک مقصد اور جارحیت حیاتِ انسانی کا نصب العین قرار پا چکی ہے۔ عہدِ حاضر کی مسموم فضا میں بین الاقوامی قانون ایک ایسا بیمار بچہ ہے جس نے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دی ہے اور بزمِ اقوام کو ایک گلدستہ کی حیثیت سے اس کی قبر پر چڑھایا گیا ہے۔"

اسی جنگی کیفیت نے کلیت پسند ریاستوں کے وجود کے لیے راستہ ہموار کیا ہے۔ جب کسی قوم کے اندر ایک مستقل ڈر اور خوف کا احساس موجود رہے تو اُس کے افراد اپنے تحفظ و بقا کے لیے اپنے حقوق سے از خود دستبردار ہو کر اپنے گلے میں آمریت کا طوق پہن لیتے ہیں۔ فاضل مصنف اسی پہلو پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"جدید جنگ لڑنے کے لیے — خواہ اُس میں کامیابی ہو یا ناکامی — ایک ضروری چیز یہ ہے کہ زندگی کے سارے شعبوں کو براہِ راست حکومت کی تحویل میں دے دیا جائے۔ جب ملک میں معاشی حالات دگرگوں ہو جائیں اور اضطراب دبے چینی بڑھے تو ریاست کا کنٹرول لابدی ہو جاتا ہے۔ کلیت پسندی انتخاب و اختیار کا معاملہ نہیں رہتا بلکہ یہ ایک ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کی ہر حکومت اپنے اقتدار میں اضافہ کرنے کے لیے قوم کو جنگ کی آگ میں جھونکنے کے منصوبے بناتی رہتی ہے۔"

پھر دورِ جدید میں جنگ کا آغاز مفادات کے تصادم سے نہیں ہوتا بلکہ محض جذبات کی شعلہ فشانیاں اسے شروع کرتی ہیں۔ نیشنلزم کی بدمستی جو موجودہ قتل و غارت کی اصل بنیاد ہے، صرف جذبات کی پیداوار ہے۔ اس کے پیچھے کوئی عقل کام نہیں کرتی۔ قومیت پرستی کی خام خیالیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فاضل مصنف لکھتا ہے:۔

"نیشنلزم سے مراد یہ احساس ہے کہ دنیا کی ہر قوم کو سیاسی آزادی کا حق حاصل ہے۔ یہی احساس پھر آگے بڑھ کر یہ شکل اختیار کر لیتا ہے کہ قوم کا حق سب پر غالب ہے اور اس طرح آہستہ آہستہ افراد کے مفادات ختم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ جلد ہی ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب ایک قوم داخلی طور پر کلیت پسند بن جاتی ہے اور خارجی معاملات میں وہ اپنے حقوق کا تفوق دنیا کی دوسری ساری اقوام پر جتانا شروع کر دیتی ہے اور اس امر کے لیے کوشاں رہتی ہے کہ وہ سب اسے تسلیم کر لیں۔ یہیں سے استعمار پرستی کی لعنت جنم لیتی ہے ... اور معصوم نیشنلزم خونخوار امپیریلزم کا روپ دھارتا ہے۔"

نیشنلزم کے دیو استبداد نے ہمارے اس عہد میں سفاکی، آدم بیزاری، زبردست آزاری کی جو مختلف صورتیں اختیار کر رکھی ہیں یہ ایک ایسی دل فگار داستان ہے جس سے آج کوئی انسان ناواقف نہیں۔ لیکن اس نے انسانی اخلاق پر جو اثرات مرتب کیے ہیں وہ انسانیت کے نقطہ کے لیے سم قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قومیت پرستی جس احساس کی انسان کے دل و دماغ میں آبیاری کرتی ہے وہ یہ ہے کہ میری قوم جو کچھ کرے وہی صحیح اور برحق ہے اور وہی دنیا کا اصلی اور حقیقی اخلاقی معیار ہے۔ اس تصور نے اخلاقی اقدار کی ایسی مٹی پلید کی ہے کہ اس کی نظیر تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ اخلاق کے وہ معیار جو معروضی تھے اور جن کی مدد سے ہم کسی فعل کے حق اور ناحق ہونے کا فیصلہ کرتے تھے اب بدل چکے ہیں۔ اُن کی حیثیت اب ایک معیار اور پیمانے کی نہیں رہی بلکہ وہ اب ایسے نیاز مند قسم کے خدام بن کر رہ گئے ہیں جو ہمارے ہر قول اور فعل کی بلا چون و چرا تائید کرتے چلے جاتے ہیں۔

کتاب کے آخری حصے میں فاضل مصنف نے ایک نہایت ہی صحیح بات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ کہتا ہے کہ اگر دنیا انسانیت کے صحت مند اور عادلانہ نظام کی طالب ہے اور وہ اس ظلم و جور کو اس کائنات سے مٹا دینے کا عزم رکھتی ہے تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ نہ صرف اچھے مقاصد سے محبت کرے، بلکہ اس کا فرض یہ بھی ہے کہ ان مقاصد کے حصول کے لیے اچھے طریقے اختیار کیے جائیں۔